کتاب وحکمت

شیخ الحدیث مفتی محمد عبدہ الفلاح

فہم قرآن کے بنیادی اُصول☆

قرآنِ پاک نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور آنحضرت ﷺ کی صداقت پر دائمی معجزہ، اس نے اپنے نزول کے ساتھ تاریخ عالم کا دھارا بدل دیا اور پھر اپنی جامعیت اور گہرائی کے اعتبار سے ہر دور میں انسانی عقل و فکر کے لئے رہنما ہے۔ اس کی زبان معجزانہ ہے اور اندازِ بیان اچھوتا، اس کی تفسیر و تاویل، اِعجاز و اِعراب، تاریخ و جغرافیہ، اُسلوبِ بیان وغیرہ پر جس قدر لکھا جاچکا ہے وہ بھی معجزہ سے کم نہیں۔ ہر دور میں مفسرین نے اپنے خصوصی ذوق اور ماحول کے مطابق اس کی خدمت کی ہے جس سے تفسیر اور علومِ قرآنی کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ دوسری صدی کے علماء کی تفاسیر پر نظر ڈالیں تو وہ صرف صحابہ و تابعین کے اقوال پر مشتمل نظر آئیں گی مگر اس کے بعد ہر دور میں علومِ تفسیر میں اضافہ ہی نظر آتا ہے حتیٰ کہ فی زمانہ یہ علوم اس قدر پھیل چکے ہیں کہ کسی ایک علم پر اِحاطہ بھی مشکل ہے اور علومِ تفسیر نے اس قدر ارتقائی شکل اختیار کرلی ہے کہ ان کا تاریخی جائزہ بھی بجائے خود ایک اہم موضوع بن چکا ہے۔ ان علوم کے ارتقاء اور ان کی تفصیل سے قطع نظر یہاں پر ہم صرف ان وسائل و عناصر کو موضوعِ سخن بناتے ہیں جو قرآن فہمی میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں اور جن کے ملحوظ نہ رکھنے سے قرآن فہمی مشکل ہے اور پھر ان عناصر کی تربیتی حیثیت سے صرفِ نظر کرنا بہت سی گمراہیوں اور لغزشوں کا موجب بن سکتی ہے۔

اس باب میں تتبع اور جستجو کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علمائے تفسیر نے قرآن فہمی اور تفسیر بالماثور کے سلسلہ میں عموماً چار چیزوں سے استفادہ کیا ہے اور دورِ حاضر میں بھی ان کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے اور ہم عجمیت زدہ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کا مطالعہ انہی بنیادی اُصولوں کی روشنی میں کریں تاکہ قرآن فہمی کا دشوار راستہ سہل ہو جائے۔ اب ہم ان اُصول و عناصر میں سے ہر ایک کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

قرآن کی تلاوت اور اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے بعض حقائق کو ذہن نشین کرنے کے لئے متعدد مقامات پر اُن کا اِعادہ کیا ہے لیکن ہر مقام پر اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ ایک مقام پر اگر اجمال ہے تو دوسرے مقام پر اسی کو تفصیل سے بیان فرمادیا ہے اور پھر مقصد و اِستدلال کے اعتبار سے بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بعض آیات میں اگر اِطلاق ہے تو دوسری آیت

☆ دارالحدیث، راجووال کے دورۂ تفسیر میں یہ مقالہ پڑھا گیا..... (۱۹۷۵ء) ترجمہ عربی عبارات: حسن مدنی

میں اسے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر اگر عموم ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے پھر اسی قسم کے اندازِ بیان کے پیش نظر قرآن نے اپنے آپ کو ﴿كِتَابًا مُتَشَابِهًا﴾ اور مَثَانِي فرمایا ہے اور اسی تکرار کو تصریفِ آیات سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے اسی پیرایہ بیان کے پیش نظر علماء نے لکھا ہے:

(ا) قرآن کی تفسیر، قرآن کے ذریعے

القرآن یفسّر بعضُه بعضًا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی وضاحت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن فہمی کے لئے یہ لازم ہے کہ اولاً خود قرآن سے ہی رہنمائی حاصل کی جائے۔ علمائے تفسیر نے اس کو اولیٰ اور بنیادی حیثیت دی ہے، چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کا سب سے بہتر طریق کیا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اولاً قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے" (مقدمہ تفسیر، ص ۳)

حافظ ابن تیمیہؒ نے متعدد مقامات پر اسی اصل پر زور دیا ہے چنانچہ فتاویٰ، ۱۳/۳۶۳ پر رقمطراز ہیں

"اصح طریق یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے تلاش کی جائے کیونکہ قرآن میں ایک مقام پر اگر اِجمال ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے، اسی طرح ایک مقام پر اختصار ہے تو دوسرے مقام پر اسی مفہوم کو قدرے اِطناب (طوالت) سے ذکر فرمایا گیا ہے۔"

(i) مثلاً سورۂ مؤمن آیت ۸۲ میں ہے ﴿وَإِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ﴾

"کہ اگر یہ سچا ہے تو تمہیں وہ کچھ پہنچ کر رہے گا جس کا تم سے وعدہ کر رہا ہے"

یہاں پر بَعْضُ الَّذِيْ سے مراد دنیا میں عذاب کا آنا ہے کیونکہ اسی سورہ کے آخر میں ہے:

﴿وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ﴾ (آیت ۷۷)

"اگر ہم تمہیں وہ بعض جس کا وعدہ کرتے ہیں دنیا میں دکھلا دیں یا اس سے پہلے تمہیں فوت کر لیں تو ان لوگوں نے بہر حال ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے"

(ii) سورۃ نساء (آیت ۲۷) میں ہے:

﴿وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا﴾

"جو لوگ اپنی شہوات کے تابع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بری طرح گمراہ ہو جاؤ"

"جو لوگ" سے اہل کتاب مراد ہیں کیونکہ اسی سورہ (آیت: ۴۴) میں ہے ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ﴾

"تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب سے بہرہ ور کئے گئے کہ وہ گمراہی اختیار کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ"

(iii) سورۂ بقرہ (آیت:۳۷) میں ہے ﴿فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَبِّهٖ كَلِمَاتٍ﴾
"پس آدمؑ نے اپنے پروردگار سے چند کلمات لے لئے"

سورۂ اعراف (آیت:۲۳) میں ان کلمات کی تفصیل مذکور ہے یعنی ﴿قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے جانوں پر ظلم کیا، اگر ہمارا گناہ معاف نہ ہوا اور ہم پر رحم کی نظر نہ کی تو ہم خائب وخاسر ہو جائیں گے"

(iv) اسی طرح آیت ﴿لاَتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام:۱۰۳) کی وضاحت سورۂ قیامہ کی آیت ۲۳ ﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ سے اَخذ کر سکتے ہیں۔

(v) سورۃ المائدہ میں آیت ﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّامَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ کی تفسیر آیت نمبر ۳ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ سے کردی گئی ہے۔

(vi) مطلق و مقید کی مثال میں آیتِ وضو اور آیت تیمّم پیش کر سکتے ہیں کہ آیتِ تیمّم میں ﴿وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ مطلق ہے اور آیتِ وضو میں ﴿اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ کے ساتھ مقید ہے جیسا کہ اکثر شوافع کا مسلک ہے۔

(vii) اسی طرح بعض علماء کے نزدیک آیتِ ظہار میں ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ﴾ آیتِ قتل میں ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ کے ساتھ مقید ہے۔

(viii) سورۂ بقرہ (آیت ۲۵۴) میں قیامت کے دن خِلّت یعنی دوستی کی نفی مذکور ہے۔ مگر زخرف (آیت ۶۷) ﴿اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلاَّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ فرما کر مؤمنین کو مستثنیٰ کیا ہے۔

☆ تفسیر القرآن بالقرآن کے سلسلہ میں اختلافِ قراءات کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین بعض آیات کی تفسیر میں اختلافِ قراءت سے استفادہ کرتے رہے ہیں مثلاً سورۃ الاسراء (آیت:۹۳) ﴿اَوْيَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں مِنْ ذَهَبٍ ہے جس سے لفظ زُخرف کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آیت ﴿فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ میں ایک قراءت ﴿فَامْضُوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ ہے جس سے سَعی کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سی قراءات ہیں جن سے نفس آیت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قراءت تو تفسیر کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:

"اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوالات حضرت ابن عباسؓ سے استفسار کئے بغیر ہی حل ہو جاتے" (المذاہب الاسلامیہ فی التفسیر)

بلکہ بعض علماء نے تفسیری ارتقاء کے سلسلہ میں اختلافِ قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہ و تابعین نے اختیار کیا۔ مگر اس سلسلہ میں یہ بات

یاد رکھنے کی ہے کہ قرأتِ متواترہ تو نصوصِ قرآن کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن قراءاتِ شاذہ کو ہم تفسیری مراجع میں شمار کر سکتے ہیں۔

تفسیر القرآن بالقرآن کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ متاخرین میں سے حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر کو بطورِ مثال پیش کر سکتے ہیں جو کہ تفسیر القرآن بالقرآن کے سلسلہ میں نہایت معتمد تفسیر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ، ابن تیمیہؒ کے تلمیذِ رشید تھے اور حافظ تیمیہؒ اس طرزِ تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور پھر حافظ ابن کثیر خود بھی سلفی نقاد تھے اور سلف کے طرزِ تفسیر کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بنا پر ان کی تفسیر ایک تو سلف کے مسلک کی ترجمان نظر آتی ہے اور دوسرے، اس میں اسرائیلیات پر تنقید بھی ہے جس سے علامہ طبریؒ کی تفسیر معریٰ (عاری) نظر آتی ہے۔ ہندوستانی علمائے تفسیر میں شیخ الاسلام امرتسری وہ واحد عالم ہیں جنہوں نے تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن خالصتاً اسی طرز پر لکھی ہے۔ یہ تفسیر گو مختصر ہے لیکن موصوف کی یہ کوشش (اس حوالے سے) قابل قدر ہے۔

(۲) قرآن کی تفسیر، حدیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

قرآن فہمی کے سلسلہ میں سنتِ نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے بلکہ آئمہ نے سنتِ نبوی ﷺ کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ آیت ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ (النحل ۴۴) میں قرآن کی تبیین کو اہم ترین فریضہ رسالت بتلایا گیا ہے۔ اس بنا پر علمائے اسلام نے سنتِ نبویؐ کی تدوین میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کی حجیت سے انکار دراصل تفسیر بالرائے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لئے اس کو لازم قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ الرسالۃ (رقم ۳۰۳) میں لکھتے ہیں:

"آنحضرتؐ نے جو بھی فیصلہ صادر فرمایا ہے، وہ قرآن سے سمجھ کر ہی صادر فرمایا ہے"

اس بنا پر علماء نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ قرآن فہمی پر بحث کے دوران لکھتے ہیں: (فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۱۳ ص ۳۶۳، ۳۶۴)

"اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے، اس بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا: ألا إني أوتيت القرآن ومثله معهٗ يعني السنة" اور سنت بھی وحی ہے جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ ائمہ نے اس پر دلائل پیش کئے ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں سنت کو مرجع ثانی کی حیثیت دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے" (مقدمہ تفسیر، ص ۳)

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں، ان کی تفسیر و توضیح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے..... ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک قرآن میں اَحکام کا تعلق ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں لہٰذا تفسیر قرآن کے اس حصہ کے لئے سنت کی طرف رجوع ناگزیر ہے" (ص ۳۳)

دو اعتراض اور ان کے جوابات

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں ضعیف روایات کا کیا کیا جائے۔ چنانچہ احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: "ثلاثة ليس لها أصل: التفسير والملاحم والمغازي" کہ تین قسم کی کتابیں بے اصل روایات پر مشتمل ہیں۔ یعنی تفسیر ملاحم اور مغازی۔ تو پھر تفسیر بالحدیث پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے جبکہ ان سے اِستناد ہی جائز نہیں ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ساری روایات مراد نہیں ہے بلکہ احمد بن حنبلؒ کے پیش نظر خاص قسم کی کتابیں ہیں جن کی وہ تردید کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں: "وأما كتب التفسير فمن أشهرها كتابا الكلبي و مقاتل بن سليمان وقد قال أحمدؒ في تفسير الكلبي من أوله الى آخره كذب"

پھر اگر ہر قسم کی تفسیری روایات امام احمدؒ کے نزدیک غیر مستند ہوتیں تو امام موصوف اس تفسیری صحیفہ کی تحسین نہ فرماتے جو کہ علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں بلکہ امام نے اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے (الفوز الکبیر) چنانچہ امام بخاریؒ اپنی تفسیر میں اسی صحیفہ پر اعتماد کرتے نظر آتے ہیں۔

☆ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ تفسیر مرفوع بلاشبہ حجت ہے لیکن اس کا وجود بہت کم ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "لم يكن النبي ﷺ يفسر شيئا من القرآن إلا آيات تُعَدُّ علّمهن النبي ﷺ إياه جبريل" یعنی "نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی صرف گنتی کی چند آیات کی تفسیر کی ہے، جن کی تفسیر جبرئیلؑ نے آپ کو سکھلائی تھی"

اس طرح امام سیوطیؒ اس موضوع پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

"الذي صح من ذلك قليل جدا بل أصل المرفوع منه في غاية القلة" یعنی "حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے"..... اس لئے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت قرار دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث پیش کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ مرفوع حدیث کی قلت کا دعویٰ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے پورے

قرآن کی تلاوت فرمائی ہے، اسی طرح قرآن کے معانی و مطالب بھی بیان کئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ سورۂ نحل آیت ۴۴ میں قرآن کی تبیین کو آنحضرتؐ کے فرائض میں رکھا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بالتبع دوسرے علماء نے دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے جن میں سے ہم بعض کی طرف بالاختصار اشارہ کرتے ہیں:

(۱) ابو عبدالرحمٰن السلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی، ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ کا بیان ہے کہ جب ہم آنحضرتؐ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک اس کے معنی و مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملاً اپنا نہ لیتے، ان سے آگے نہ بڑھتے۔ چنانچہ صحابہؓ کا بیان ہے: "فتعلّمنا القرآنَ والعلم والعمل جميعا" "ہم نے قرآن کا علم اور اس پر عمل کرنا بیک وقت سیکھا"..... یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے۔ مؤطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "انہوں نے سورہ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے" اور حضرت عمرؓ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی اور ظاہر ہے کہ یہ محض قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی بلکہ اسکے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

حافظ ابن تیمیہؒ فتاویٰ میں مزید وضاحت کے طور پر لکھتے ہیں:

> "اور اس بات کو ہم عادتاً باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کوئی شخص مثلاً طب یا حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر سمجھنے کے پڑھنا (آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہو سکتا ہے) مگر صحابہ کرامؓ سے اس کا تصور بھی بعید ہے خصوصاً جبکہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق حاصل کرنے پر بھی حریص رہتے تھے" (فتاویٰ، ج ۱۳، ص ۳۳۱ تا ۳۳۳)

بحث روایتِ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ

پھر جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں، ان کا حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے کیونکہ اولاً تو حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہیں جس پر امام بخاریؒ اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے۔ خود امام طبریؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں: "إنه ممّن لا يعرف في أهل الآثار" یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو اہل روایت میں سے کوئی نہیں جانتا۔

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرطِ صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ یعنی حضرت عائشہؓ کے اس بیان کا تعلق قرآن کی تفسیر کے اس حصہ سے ہے جو غیبی اُمور سے متعلق ہے۔ مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیتِ الٰہی کے خلاف تھا جیسا کہ

آنحضرت ﷺ نے جبریلؑ کے جواب میں "ما المسئول عنها بأعلم من السائل" (جس سے پوچھا جارہا ہے، وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا) کے جملہ سے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔

نیز امام طبریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں :

"تفسیر چار قسم پر ہے، ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے تھے۔ اس نوع کے تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی..... اور چوتھی قسم وہ جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اسکا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تفسیر سے آنحضرتؐ تعرض نہ فرماتے تھے"

الغرض آنحضرت ﷺ نے قرآن کی تفسیر و تشریح فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث وسنن میں محفوظ ہے۔ اسی بنا پر علماء نے قرآن وسنت کو لازم وملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو قرآن کا شارح تسلیم کیا ہے۔

امام اوزاعیؒ حسان بن عطیہ سے بیان کرتے ہیں :

"آنحضرت ﷺ پر قرآن کی وحی نازل ہوتی تو پھر حضرت جبریلؑ قرآن کی تفسیر کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے"

یہی امام اوزاعیؒ، مکحول سے روایت کرتے ہیں کہ "القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلى القرآن" کہ قرآن اپنی تشریحات میں جس قدر سنت کا محتاج ہے سنت کے مطالب کی وضاحت کے لئے قرآن کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اقوالِ صحابہؓ

اگر قرآنِ کریم کی کوئی مشکل خود قرآن اور حدیث سے حل نہ ہو رہی ہو تو اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع لازم ہے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ جاہلی اَدب، اہل کتاب کے عادات و اَطوار اور لغت کے اَوضاع واَسرار سے بخوبی واقف تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن اَحوال وظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اُن کی نظروں کے سامنے تھے اور وہ آیات کے پس منظر سے آگاہ تھے پھر ان کے اَذہان بھی صاف ستھرے اور گردوپیش کی آلائشوں سے منزہ تھے۔ ان جملہ وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: (مقدمہ تفسیر)

"صحابہ کرامؓ اس وقت کے قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم، علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا"

اس بنا پر علماء نے قرآن وسنت کے بعد اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے خصوصاً ان صحابہؓ میں سے خلفاءِ اربعہ اور اصحابِ علم وفضل کے اقوال سے بے اعتنائی ناممکن سی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ بھی اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وحنيئذ إذا لم نجد التفسير في القرآن ولا في السنة رجعنا في ذلك إلى

أقوال الصحابة فإنهم أدرى بذلك لما شاهدوه من القرآن والأحوال التى اختصوا بها ومالهم من الفهم التامّ والعلم الصحيح والعمل الصالح.....الخ"

"جب ہمیں کسی آیت کی قرآن اور سنت میں تشریح نہ ملے تو ہم صحابہ کے اقوال کی طرف رجوع کریں گے کیونکہ وہ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے بایں وجہ کہ وہ نزولِ وحی کے وقت موجود تھے، اور ان حالات سے جن میں قرآن نازل ہوا، اُنہیں آگاہی تھی، علاوہ ازیں وہ مکمل فہم وفراست، صحیح علم اور نیک اعمال کی خوبیوں سے متصف تھے"

تتبع سے ثابت ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ نے مصادرِ خمسہ سے استفادہ کیا ہے: قرآن وسنتِ نبوی جن کا بیان گزر چکا ہے، علاوہ ازیں تین مآخذ حسب ذیل ہیں جن کی حیثیت پر ہم بحث کرتے ہیں :

(الف) اسبابِ نزول کی معرفت

(ب) تورات وانجیل (اسرائیلیات)

(ج) اَوضاعِ لغت اور ادبِ جاہلی

(الف) اَسبابِ نزول

بلاشبہ قرآنِ پاک تدریجاً بحسب الحوائج نازل ہوا ہے۔ قرآن کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداء موعظت وعبرت یا اصولِ دین اور احکامِ تشریع کے بیان میں نازل ہوا ہے لیکن قرآن کا کچھ حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اُترا ہے۔ علماء نے ان حوادث/سوالات کو اَسباب سے تعبیر کیا ہے (قرطبی، ص ۳۹)

اسبابِ نزول کے علم سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے اور آیت کے سبب سے جہالت بسا اوقات حیرت کا موجب بنتی ہے، اس لئے اسبابِ نزول کی معرفت کو علم تفسیر میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور علماء نے علومِ قرآن پر جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں اسبابِ نزول کے عنوان کو مستقل طور پر ذکر کیا ہے بلکہ خالصتاً اسبابِ نزول پر بھی کتابیں مرتب کی ہیں، علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں:

"أفرده بالتصنيف جماعة أقدمهم علي ابن المدينى شيخ البخاري"

"علما نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تصنیف علی بن مدینی کی ہے جو امام بخاری کے شیوخ سے ہیں"

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے اس سلسلہ کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد ۴۶۸ھ) کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی فيه أعواز (اس میں مشکلات ہیں) کہہ کر اس پر طنز بھی کردی ہے اور حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) کی اسبابِ نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "فات عنه مسودة فلم نقف عليه كاملا"

"انکی کتاب کا مسودہ ضائع ہوگیا جس کی وجہ سے ہم پوری طرح اس سے فیض یاب نہیں ہوسکے"

پھر امام سیوطیؒ نے خود بھی اس موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کے متعلق لکھتے ہیں:

وألفت فيه تأليفا موجزا لم يُولف مثله فى هذا النوع سمّيته لباب النقول فى أسباب النزول" "اس موضوع پر میری بھی ایک یگانہ روزگار تالیف ہے جس کا نام میں نے لباب النقول في أسباب النزول رکھا ہے"

بہر حال اسبابِ نزول کی اہمیت کے پیش نظر علما نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسباب کے بیان کا اہتمام کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ الفوز الکبیر میں اس کی معرفت کو المواضع الصّعبة (مشکل مقامات) سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح (واضح / جدا جدا) کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے لہٰذا جن علماء نے اس کی افادیت اور تاریخی حیثیت کو "لا طائل" (بے فائدہ) کہا ہے، ان کا موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور دیگر بعض علماء نے اس میں غلو کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اسبابِ نزول کی معرفت کے بغیر تفسیر قرآن نہیں ہو سکتی اور علامہ سیوطیؒ اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر قرآن پر اِقدام کو حرام قرار دیتے ہیں تاہم یہ دونوں گروہ اِفراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اصل اور صحیح موقف ان کے بین بین ہے جیسا کہ ابن دقیق العیدؒ اور ابوالفتح قشیریؒ نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اس فن کی معرفت فی الجملہ معاون ہو سکتی ہے ورنہ تفسیر قرآن صرف اس پر موقوف نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ اپنے مقدمة التفسير میں لکھتے ہیں:

معرفة سبب النزول تعيّن على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبّب "سببِ نزول کی معرفت آیت کے سمجھنے میں معاون ہے کیونکہ سبب کی معرفت کے ذریعے مسبّب تک رسائی ہو جاتی ہے"

حقیقتِ حال: صحابہ یا تابعین نے جو اَسبابِ نزول بیان فرمائے ہیں، وہ دو قسم پر ہیں: اول وہ جن کی طرف خود آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً مغازی یا دیگر واقعات کہ جب تک ان واقعات کی تفصیل سامنے نہ ہو متعلقہ آیت میں مذکورہ جزئیات ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔ اس قسم کے اسبابِ نزول کے متعلق تو واقعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مفسر قرآن کے لئے اِن پر عبور لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے تاریخ جاہلیت اور مغازی کی معرفت کو قرآن فہمی کے لئے لازمی قرار دیا ہے کیونکہ متعلقہ آیات میں ان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

لیکن دوسری قسم کے اسبابِ نزول وہ ہیں جنہیں صحابہ یا تابعین کسی آیت کے تحت نُزِلَتْ فی كذا یا أنزل الله في كذا کے الفاظ سے ذکر کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کو ایک طرف کی مناسبت سے تو آیت کے تحت ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ آیت کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے ان کی معرفت لازمی نہیں ہے (فتاویٰ ج ۳، ص ۳۳۸، ۳۴۰) شاہ ولی اللہؒ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں:

"وقد ذكر المُفسّرون تلك الحادثة بقصد الإحاطة بالآثار المناسبة للآية أو بقصد بيان ماصدق عليه العموم وليس هذا القسم من الضروريات..... وكان

غرضهم تصوير ما صدقت عليه الآية"

"بسا اوقات مفسرین آیت کے تحت کوئی واقعہ اس مقصد سے ذکر کر دیتے ہیں کہ اس آیت سے مناسبت رکھنے والے واقعات جمع ہو جائیں یا جس امر کی عموم تصدیق کر رہا ہو اس کی وضاحت ان کا مقصود ہوتی ہے۔ یہ قسم ضروری اسبابِ نزول سے نہیں ہے۔ اس سے ان کا مقصد اس امر کی تصویر کشی کرنا ہوتا ہے جس پر آیت صادق آسکتی ہے"

پہلی قسم کے اسباب کے بیان میں چونکہ صحابہؓ کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ سراسر روایت وسماع پر مبنی ہوتا ہے۔ اس بنا پر علما نے بلا اختلاف اس کو حدیثِ مسند کا درجہ دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں

"وإذا ذكر سببا نزلت عقبه فإنهم كلهم يدخلون مثل هذا في المسند، لأن مثل ذلك لايقال بالرأي" "صحابی جب کسی آیت کے سبب نزول میں "اس کے معا بعد یہ آیت نازل ہوئی" جیسے الفاظ استعمال کرے تو اس طرح کی روایات حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہیں کیونکہ اس طرح کی بات فقط رائے سے نہیں کہی جاسکتی"

اور دوسری قسم (یعنی جب کوئی صحابی نَزَلت في كذا کے الفاظ استعمال کرے) میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد ورائے پر ہے۔ امام حاکم علوم الحدیث میں لکھتے ہیں :

وإذا أخبر الصحابي الذي شهد الوحي والتنزيل عن آية من القرآن أنها نزلت في كذا، فإنه حديث مسند و مشى على هذا ابن الصلاح وغيره

"جب کوئی صحابی جو نزولِ وحی / آیت کے وقت موجود تھا، قرآن کی کسی آیت کے بارے میں خبر دے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تو یہ بھی حدیثِ مرفوع ہے، یہی رائے ابن صلاحؒ وغیرہ کی بھی ہے"

مگر حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل و توزیع کے قائل نظر آتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ان الفاظ سے سبب نزول مراد ہے تو یہ تمام کے نزدیک حدیثِ مسند میں داخل ہے اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے (مگر اس کا سببِ نزول نہیں ہے) تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں۔ امام بخاریؒ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں لیکن دوسرے علماء اس کا انکار کرتے ہیں اور اکثر مسانید اسی اصطلاح کے مطابق جمع کی گئی ہیں۔ جیسے مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ اور اکثر علماء کا میلان بھی امام احمد بن حنبل کی طرف ہے، چنانچہ زرکشیؒ لکھتے ہیں:

"قد عرف من عادة الصحابة والتابعين أن أحدهم إذا قال نزلت هذه الآية في كذا فإنه يريد بذلك أنها تتضمن هذا الحكم لا أن هذا كان السبب في نزولها فهو من جنس الاستدلال على الحكم بالآية إلامن جنس النقل لما وقع"

"صحابہؓ و تابعینؒ کی یہ معروف عادت ہے کہ جب وہ "یہ آیت فلاں مسئلے میں نازل ہوئی" کہیں تو اس سے ان کی یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ آیت اس حکم کو شامل ہے نہ کہ فلاں واقعہ اس آیت کا سببِ نزول ہے۔ پس صحابہؓ کا یہ کہنا آیت سے کسی حکم کے بارے میں استدلال کرنے کی قبیل سے ہوتا ہے نہ کہ واقعہ کی خبر نقل کرنے کی جنس سے" (ج ۱ ص ۳۱، ۳۲)

الغرض اسبابِ نزول کے بیان میں صحابہ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو صحابی کو خود بھی اپنے بیان پر اعتماد نہ ہوتا اور وہ أحسب هذه الآية نزلت في كذا (میرا گمان ہے کہ یہ آیت فلاں واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی) کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا لہٰذا اسبابِ نزول کے بیان میں احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم صحابہ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ واحدیؒ لکھتے ہیں: "لايحل القول فى أسباب نزول الكتاب إلابالرواية والسماع ممن شاهدوا التنزيل ووقفوا على الأسباب و بحثوا عن علمها"

"کتاب اللہ کے اسبابِ نزول کے بارے میں کچھ کہنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہی صحابہ کی روایت اور سماع معتبر ہے جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے اور وہ اس کے اسباب سے واقف تھے اور اسی کے جاننے کے لئے بحث و کرید میں لگے رہتے تھے۔"

اس بنا پر سلف رحمہم اللہ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک کسی صحابی سے صحتِ سند کے ساتھ اس کا مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے۔ ابن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہؒ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

"اتق الله وقل سدادا ذهب الذين يعلمون فيما أنزل القرآن"

"اللہ سے ڈرو اور کھری بات کہو، وہ لوگ چلے گئے جو جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا؟"

لیکن ان کے بعد علماء نے اس سلسلہ میں تساہل سے کام لینا شروع کر دیا حتیٰ کہ کذب بیانی کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ علامہ واحدی اسی قسم کے علماء پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأما اليوم فكل أحد يخترع شيئا و يختلق إفكا وكذبا ملقيا زمامه الى الجهالة غير مفكر فى الوعيد للجاهل بسبب الآية"

"اور آج تو یہ حالت ہے کہ ہر ایک کوئی چیز گھڑ لیتا، جھوٹ بنا لیتا ہے، اپنی لگام جہالت کے سپرد کرتے ہوئے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ آیت کے سببِ نزول سے ناواقف کے لئے کیا وعید ہے؟"

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شانِ نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور اپنی تفاسیر میں رطب و یابس کو جمع کر دیا بلکہ مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا۔ حتیٰ کہ امام طبریؒ جیسے مؤرخ اور مفسر بھی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اس نوع کی تفسیری روایات پر نقد و نظر کی ضرورت ہے اور جب تک کسی حادثہ کا صحتِ اسناد سے سببِ نزول ہونا ثابت نہ ہو جائے محض تفسیری روایت کی بنا پر اسے قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

اسبابِ نزول کی حیثیت

یہاں پر یہ بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ کوئی آیت اپنے نفس الامری مفہوم اور عموم کے اعتبار سے سببِ نزول کے ساتھ مقید و مختص نہیں ہوتی بلکہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کو عموم پر ہی محمول کرنا ضروری ہے۔ علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

''اصح یہ ہے کہ نظم قرآن کو اس کے عموم پر محمول کیا جائے اور اسبابِ خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے..... کیونکہ صحابہ کرامؓ پیش آمدہ واقعات کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہیں گو ان کے اسبابِ نزول خاص تھے''

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: (ج۱۵ص۳۶۴ و ایضاً ص۴۵۱)

"قَصْر عمومات القرآن على أسباب نزولها باطلٌ فإن عامة الآيات نزلت بأسباب اقتضت ذلك وقد علم أن شيئا منها لم يقصر على سببه"

''عمومِ قرآن کو اسبابِ نزول پر محدود کر دینا باطل ہے کیونکہ اکثر آیات ایسے اسباب کے تحت نازل ہوئی ہیں جو اس کے مقتضی تھے۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ کوئی آیت بھی اپنے سببِ نزول تک محدود نہیں ہے'' (بلکہ عموم لفظ کے اعتبار سے اس میں وسعت ہے)

اور پھر آگے چل کر (ص۴۵۱ پر) لکھتے ہیں:

"ورود اللفظ العام على سبب مقارن له فى الخطاب لا يوجب قصره عليه..... غاية مايقال: إنها تختص بنوع ذلك الشخص فتعم ما يشبهه.....الخ"

''کسی عام لفظ کا خطاب کے مخصوص سبب کی بنا پر آنا اس کو اس سبب سے مقید نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ الفاظ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں آئے ہیں اور اس سے ملتے جلتے لوگوں کو یہ الفاظ شامل ہوں گے''

خلاصۂ کلام: مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسبابِ نزول دو قسم پر ہیں بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور پر آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہو پاتا۔ لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو علمائے تفسیر نے اسباب کے طور پر ذکر کر دیئے ہیں ورنہ درحقیقت نہ تو وہ اسبابِ نزول ہی ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کر لینے سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کی مشکل پیش آتی ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے ''الفوز الکبیر'' میں تصریح کی ہے۔ نیز یہ کہ کوئی بھی آیت اپنے سببِ نزول کے ساتھ مختص نہیں ہوتی

بلکہ اسے عموم پر رکھنا ضروری ہے۔

(ب) اِسرائیلیات کی حیثیت

بلاشبہ قرآن پاک کو دوسری کتبِ سماویہ پر مُھَیمِن (نگہبان) کی حیثیت حاصل ہے اور اس نے بعض واقعات اور مسائل کے بیان کرنے میں تورات سے موافقت بھی کی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی وِلادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج واُسلوب کی اِتباع سے گریز کیا ہے اور ان واقعات کی غیر ضروری جزئیات کو ترک کر کے صرف انہی حصص کے بیان پر اکتفا کی ہے جن کا تعلق عبرت و موعظت سے ہے یا ان واقعات کو اہل کتاب کے سامنے بطورِ استشہاد پیش کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں اہل کتاب کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایات بھی قبول کیں تاہم صحابہ کرام نے نقل و روایت میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث "حدّثوا عن بني إسرائيل ولا حرج" (بنی اسرائیل سے روایت کرلو، اس میں کوئی حرج نہیں!) کے پیش نظر جواز کی حد تک اِن سے اِستفادہ کیا ہے اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن وحدیث اور اِسلامی عقائد سے متصادم نہ تھیں۔ (مقدمہ اصول تفسیر از ابن تیمیہؒ، ص ۲۶)

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی اسرائیلیات کی روایت تو جائز ہے لیکن بلادلیل اس کی تصدیق یا تکذیب جائز نہیں ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

"إذا حدّثكم أهلُ الكتاب فلاتصدّقوهم ولاتكذّبوهم فأما إن يُحدّثوكم بحق فتكذبوه وأما إن يحدثوكم بباطل فتصدّقوه"

"جب تمہیں اہل کتاب کوئی واقعہ ذکر کریں تو اس کی تصدیق کرو نہ اس کو جھٹلاؤ، مبادا وہ تمہیں سچی خبر دے رہے ہوں تو تم اُن کو جھٹلا دو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں غلط خبر دے رہے ہوں اور تم ان کی تصدیق کر بیٹھو"

جن صحابہ نے اہل کتاب سے روایت لی ہے ان میں سے حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان صحابہؓ کی مرویات ملاحظہ کرنے سے ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کی روایات بطورِ استشہاد نقل ہوئی ہیں نہ کہ کلیتًا انہی پر اعتماد کیا گیا ہے۔

اسرائیلیات اور تابعین

البتہ صحابہ کے بعد تابعین نے اہل کتاب سے اَخذِ روایت میں توسع سے کام لیا اور ہم سمجھتے ہیں تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ اس دور میں

بہت سے اہل کتاب مسلمان ہوگئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لئے اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے، اِس دور میں مفسرین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب ویابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنالیا، ان میں سے مقاتل بن سلیمان (۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ (۱۱۴ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس مشغلہ نے خاصی ترقی کرلی اور ہر قسم کی خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ دورِ تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔ اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل و روایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی بعض تحریروں میں اس کی تصریح کی ہے۔ شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں: "إن النقل عن بني إسرائيل دسيسة دخلت في ديننا"

"بنی اسرائیل سے روایت کرنا ایک پوشیدہ مکر ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگیا ہے"

لہٰذا قرآن کے ایک طالب علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ذکر میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور وفکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل وروایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں ممد اور معاون ہوں اور پھر سنت سے ثابت بھی ہوں (روح المعانی، ج۱۵ ص ۹۳) اور اس سلسلہ میں تفسیر ابن کثیر کا توجہ سے مطالعہ بہت مفید ہوسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی تفسیر میں متعدد مقامات پر اسرائیلیات پر تنقید کی ہے۔ البتہ اختلاف کی صورت میں ایک مؤلف ان سب کو نقل کرکے ان میں سے صحیح بات کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ پھر بہتر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اسرائیلیات کو کلیتاً ترک کرکے قرآن پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا جائے جیسا کہ قرآن نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے (الفوز الکبیر: ص۴۵، ۴۶) خصوصاً قصص کے باب میں اِجمال و تفصیل کے موقع پر خود قرآن سے تفصیلات کو اَخذ کرنے کو ایک رہنما اصول قرار دیا ہے۔

خلاصۂ بحث: صحابہ کرامؓ نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان سے روایت کو جائز سمجھا ہے تاہم اس میں حزم واحتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور اسرائیلیات کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلہ میں قبول تو کرسکتے ہیں مگر ان کو میزانِ صحت قرار نہیں دے سکتے۔

(ج) لغت ومحاورات

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ سے بھی روشنی نہ پڑتی ہو اور تابعین بھی اس کی تاویل میں مختلف ہوں تو پھر لغت عرب اور محاورات کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی

کے سلسلہ میں خود صحابہ کرامؓ اس اصل سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"الشعر ديوان العرب فاذا انعاجم علينا شيئ من القرآن رجعنا اليه"

"شعر اہل عرب کا دیوان ہے، جب ہمیں کوئی لفظ اجنبی معلوم ہوتا تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے" (مقدمہ اصولِ تفسیر لابن تیمیہؒ)

لیکن اس عنصر سے استفادہ ہر ایک کے بس کے بات نہیں صرف وہی شخص اس عنصر کو بروئے کار لاسکتا ہے جو عربی زبان میں خصوصی ذوق رکھتا ہو۔ دواوین عرب اُسے مستحضر ہوں اور عربی زبان کے اَسالیب سے بدرجہ اَتم واقفیت رکھتا ہو۔ محض لغات بینی سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ معاجم و قوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اور بلااسناد مختلف اقوال کو جمع کر دیا ہے، خصوصاً اَشعار و اَمثال جن کو حضرت ابن عباسؓ دیوانُ العرب قرار دے رہے ہیں۔ علماءِ ادب جانتے ہیں کہ اشعار کی نسبت میں اِختلاط و اِختلاف کو بے حد دخل ہے اور شاذونادر ہی کوئی ایسی روایت ہوتی جس پر اعتماد ہو سکے پھر محاوراتِ عرب کے بیان میں بھی باہم اختلاف ہے اور علمائے لغت نے تشریحات میں عمومی لغت و محاورہ کو سامنے رکھا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ الفاظِ قرآن کی تشریح و توضیح ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لغتِ قرآن ان کے سامنے ہے اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے تشریحات کی ہیں تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ علمائے لغت بھی مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق محاورات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجۂ اَتم موجود ہے۔ لہٰذا لغت و محاورہ سے استفادہ کے لئے چند اُمور کا پیش نظر رہنا ضروری ہے:

(ا) لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظِ مفردہ کے صرف اُن معانی کو پیش نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت سمجھے جاتے تھے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ عام لغت سے صرفِ نظر کر کے اولاً لغتِ قرآن و سنت کو سامنے رکھا جائے اور پھر عام لغت پر نظر ڈالی جائے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"ويرجع فى ذلك إلى لغة القرآن أوالسنة أوعموم لغة العرب"

"اس کے لئے سب سے پہلے لغتِ قرآن و سنت یا عام اہل عرب کی لغت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔" (فتاویٰ، ج ۱۳، ص ۳۷۰) ..... اور ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"والقرآن نزل بلغة قريش الموجودة في القرآن، فإنها تفسير بلغته المعروفة فيه إذ وُجدت لايُعدَل عن لغته المعروفة مع وجودها وإنما يحتاج إلى غير لغته في لفظ لم يوجد له نظير فى القرآن" (فتاویٰ، ج ۱۵ ص ۸۸)

"اور قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا جو قرآن میں موجود ہے۔ اس کی معروف لغت کے مطابق تفسیر کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی لفظ اس میں موجود پایا جائے تو اس کی معروف لغت سے انحراف کرنا درست نہیں۔ دوسری لغات کی طرف تب رجوع کیا جائے گا جب اس کی نظیر قرآن میں نہ ملتی ہو"

بایں ہمہ قواعدِ اعراب وبلاغت سے اس کے معنی ترکیبی پر غور کر لیا جائے اور سیاق وسباق پر نظر ڈال لی جائے اور پھر سیاقِ کلام سے معنی متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

"انصاف پسند مفسر کا فرض ہے کہ شرحِ غریب کی دو مرتبہ جانچ پڑتال کرے: اولاً مواردِ استعمال پر نظر ڈالے اور ترکیبِ کلام اور سیاق وسباق کے اعتبار سے جو معنی زیادہ مناسب نظر آئیں اُنہیں اختیار کیا جائے"

اس ساری تگ ودو کے باوجود یہ معنی اجتہادی ہوں گے اور ان میں اختلاف کی گنجائش ہے کیونکہ بقول شاہ صاحب ایک ہی کلمہ لغتِ عرب میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(۲) مندرجہ بالا طریق سے جو بھی متعین ہو اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت ﷺ کی ہدیٰ وسیرت کے بھی مطابق ہے؟ اور آپؐ کے اقوال وافعال اور تفسیر صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کونی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔

یہ تمام غور وفکر اور مساعی اس لئے ضروری ہیں کہ کتبِ لغت بہر حال کتبِ لغت ہیں، ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے۔ وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر حال قاصر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قرآن کے اصطلاحی الفاظ کی تشریح لغت سے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو یہ اس کا دماغی خلل ہوگا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے تفسیر کی کوشش کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ ابو عبیدہ کی مجاز القرآن ہے۔ دراصل علماءِ بدعت نے اپنے نظریات کی ترویج کے لئے اس طریق تفسیر کو رواج دیا ہے ورنہ یہ کوئی ایسا مرجع نہیں جس کی مدد سے ہم آیت کا مفہوم متعین کر سکیں۔ ہاں صرف مفردات کی وضاحت کے سلسلہ میں کتبِ لغت کچھ نہ کچھ کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ علامہ طبریؒ لکھتے ہیں:

"مفرداتِ قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لئے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے بہر حال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارۂ کار نہیں ہے"

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مواردِ استعمال کا تتبع کسی حد تک مفرداتِ قرآن کے معانی حل کرنے اور سمجھنے میں تو معاون ہو سکتا ہے اور ہے، تاہم یہ ایسا ذریعہ اور عنصر نہیں ہے کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے

تفاسیر میں لغت و محاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لئے شواہد تک کو چھان مارا ہے انہوں نے بھی اپنی تفسیروں میں سنت اور اقوالِ صحابہؓ سے اعتنا کیا ہے بلکہ ان کو مقدم رکھا ہے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے احادیث اور اقوال صحابہؓ سے مدد حاصل کی ہے۔

یہ ہیں وہ عناصر یا بنیادی اُصول جن سے قرآن فہمی کے سلسلہ میں بالترتیب اِستفادہ ضروری ہے ان کے علاوہ تاریخ جاہلیت پر عبور بھی قرآن فہمی میں معاون ہو سکتا ہے کیونکہ بعض آیات میں جاہلی تمدن اور ان کی عادات کی تردید مذکور ہے۔

☆ قرآن فہمی کے بنیادی اُصول ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ان اُمور کا جاننا ضروری ہے جو قرآن فہمی سے مانع اور حجاب بنتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"قرآن پاک کتابِ ہدایت ہے لہٰذا اسے کتاب ہدایت سمجھ کر ہی نہایت توجہ اور تدبر سے پڑھا جائے اور زندگی کے مشکل مسائل کے حل کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور قاری قرآن کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے مستغنی رہے۔"

آخر میں فرماتے ہیں: "وفي الجملة تكون همّته عاكفة على مراد ربه من كلامه"

"الغرض اس کی تمام تر کوشش قرآن کریم سے اللہ کی مراد سمجھنے میں صرف ہونی چاہئے"

بعض قارئین تلاوتِ قرآن میں حسن صوت اور اَدائے مخارج میں اس قدر تصنع اور تکلف کرتے ہیں کہ اصل مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں اور حسن قراءت کے یہ مقابلے دراصل قرآن فہمی سے حجاب بنتے ہیں۔ اس طرح اعراب، قواعدِ فصاحت وبلاغت میں استغراق بھی فہم قرآن سے مانع بن جاتا ہے۔ قرآن کے متن پر غور کی بجائے محض تفسیری مطالعہ اور اقوالِ رجال کو جمع کرنے کا مشغلہ بھی وہ حجاب ہے جو قرآن کی روح تک پہنچنے سے مانع رہتا ہے اور جو لوگ قرآن کی تلاوت ہی محض اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے خصوصی نظریات کی تائید حاصل کریں وہ ہمیشہ قرآن فہمی سے دور رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

وكل محجوبون بما لديهم عن فهم مراد الله من كلامه في كثير من ذلك أو أكثره

ہمارے ملک میں بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو قرآن سے عدول کر کے الٰہیات کے مسائل کا حل فلاسفہ اور متکلمین یا صوفیا کی کتابوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ قرآن کے مقابلہ میں ایسی کتابوں کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اس قماش کے مدہوشین کے متعلق فرماتے ہیں: "وهولاء أغلظ حجابا عن فهم كتاب الله"

"کہ اس قسم کے لوگ قرآن فہمی سے کوسوں دور ہیں"

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن فہمی کی سعادت سے ہمکنار فرمائے اور دلوں کو اپنی رحمت سے نواز دے تاکہ دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کر سکیں..... وما ذلك على الله بعزيز!